نبوّت کی ضرورت

(۵)

عبدالحمید صدیقی

گذشتہ "ترجمان القرآن" میں ہم نے بتایا تھا کہ اس کائنات کے آغاز و انجام کے بارے میں سائینس نے تذبذب کا جو موقف اختیار کیا ہے اُس سے انسان کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ انسان اس بات پر مجبور ہے کہ وہ اس کے متعلق اپنے دل و دماغ میں کوئی قطعی اور حتمی فیصلہ کرے کیونکہ اس کا یہ فیصلہ ہی اُس کی جد وجہد کا رُخ متعین کرتا ہے۔

ایک طرف انسان کا یہ فطری مطالبہ ہے اور دوسری طرف سائینس اس معاملہ میں اپنے آپ کو بالکل بے بس پاتی ہے۔ سائینس دان خواہ زبان سے برابر اس بات کا دعوے کرتے رہیں کہ ہم جو حقائق نوعِ انسانی کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ حتمی اور قطعی ہیں اور ان میں دو رائیں ممکن نہیں ہو سکتیں لیکن سائینس کا اپنا مزاج خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس میں وہ قطعیت و حتمیت پیدا نہیں ہو سکتی جو مذہب کا طغرۂ امتیاز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائینس دان اگرچہ اس بات کے دعویدار ہیں کہ ان کے نظریات کا سارا دارومدار حقائق کے مطالعہ و مشاہدہ پر ہے لیکن یہ ایک ایسا دعوے ہے جس کی سائینس دان قدم قدم پر تکذیب کر رہے ہیں۔ سائینس کا اصل مدار حقائق کے مطالعہ و مشاہدہ کی بجائے علّت و معلول کی کڑیوں اور قانونِ یکسانیت کی کارفرمائی پر ہے۔

کسی انسان کے لیے یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ حقائق کا اس انداز سے مطالعہ و مشاہدہ کر سکے کہ کائنات کا کوئی گوشہ اور حیاتِ انسانی کا کوئی پہلو اُس کی نظروں سے اوجھل نہ رہے۔ سائینس دانوں نے اپنی اس بے بسی اور درماندگی کو بالکل آغاز ہی میں پوری طرح محسوس کر لیا

تھا اس لیئے اُنھوں نے حقائق سے نتائج اخذ کرنے میں زیادہ تر انحصار قانون یکسانیت پر کیا ہے۔

کائنات کے پورے حقائق کے مطالعہ اور مشاہدہ کی بجائے قانون علّت اور قانون یکسانیت پر اعتماد خود اس بات کا ثبوت ہے کہ سائینس دانوں کا اپنا موقف بڑا کمزور ہے اور اپنے کسی نظریہ کے معاملے میں وہ کوئی قطعی رائے دینے سے قاصر ہیں۔

جس چیز کو یہ حضرات مطالعہ و مشاہدہ کے دلفریب نام سے پکارنے کے عادی ہیں اُس کی حقیقت صرف اسی قدر ہے کہ کائنات میں پھیلی ہوئی مختلف اشیاء جو اس کی زد میں آکر انسان کے قلب و دماغ پر ایک خاص نوعیت کے تاثرات پیدا کرتی رہتی ہیں۔ اگر سائینس دان اپنے اسی دعوے پر قناعت کرتے تو اختلاف کی کوئی زیادہ گنجائش پیدا نہ ہوتی۔ نزاع کا آغاز اُس مقام سے شروع ہوتا ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ان کا یہ مشاہدہ و مطالعہ بالکل صحیح اور درست ہے اور اُنھوں نے اس سے جو نتائج اخذ کیے ہیں اُن کو کسی صورت بھی چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

اگر سائینس دانوں کے اس دعوے کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اُن کے اس دعوے کی حقیقت لاف زنی سے کچھ زیادہ نہیں۔

سب سے پہلے کوئی شخص جو کچھ بھی عقل رکھتا ہے یہ دعوے نہیں کرسکتا کہ اُس کے حواس ہر لحاظ سے صحیح اور درست ہیں اور وہ چیزوں کو جس انداز سے ادراک کرتے ہیں ان میں کوئی سقم نہیں آسکتا۔ حواس میں غلطی کا پورا پورا امکان ہے اور ان کے نتائج میں بھی شک و شبہ کی پوری گنجائش موجود ہے۔

حضرت امام غزالیؒ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف المنقذ میں حواس پر نہایت مختصر مگر فکر انگیز بحث کی ہے۔ اُنہوں نے بتایا ہے کہ جب تحقیق اور تجربہ سے انہیں یہ معلوم ہُوا کہ نفس انہیں یقین کی دولت عطا نہیں کرسکتا تو پھر اُن کی نظریں حسّیات کی طرف متوجہ ہُوئیں اور اُنہوں نے یہ سوچا کہ شاید ان کے ذریعے ہی انہیں یہ دولت ہاتھ آجائے لیکن اس معاملے میں بھی انہیں سخت ناکامی ہوئی۔ اُنہوں نے دیکھا کہ وہ قوت باصرہ جس پہ ہمارے مشاہدہ کا سارا دارومدار ہے،

وہ بھی ہمیں قدم قدم پر دھوکہ دیتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر انسان جب سایہ کو دیکھتا ہے تو بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس میں کوئی حرکت و جنبش نہیں اس لیے وہ اسے ساکن ہی سمجھتا ہے درانحالیکہ یہ سایہ برابر حرکت کرتا رہتا ہے۔ ہاں اس کی حرکت دفعتاً اور اچانک ظہور میں نہیں آتی بلکہ آہستہ آہستہ اور بتدریج ظہور میں آتی ہے۔ اسی طرح جب یہ آنکھ ستارے کو دیکھتی ہے تو اسے یہ نہایت چھوٹا نظر آتا ہے لیکن دوربین سے یہ بہت بڑا دکھائی دیتا ہے۔ پھر ہندسی دلائل سے بھی یہ معلوم ہوا ہے کہ فضائے آسمانی میں ہمیں جو ننھی ننھی قندیلیں جھلملاتی نظر آتی ہیں اُن میں سے کئی ایک ایسی ہیں جو وسعت کے اعتبار سے اس کرۂ ارضی سے کئی گنا بڑی ہیں اور لاتعداد سیارے اور ستارے ایسے ہیں کہ ابھی انسان کے ادراک سے بھی باہر ہیں۔

اس بنا پر سائنس دانوں کا یہ دعویٰ کہ وہ محض مشاہدہ کی مدد سے حقیقت کا پوری طرح ادراک کر سکتے ہیں بالکل غلط ہے اور یہ بالکل اُسی طرح کی لاف زنی ہے جس کا اظہار گذشتہ دنوں اُس روسی ہوا باز نے کیا جس نے فضا میں زمین کے گرد چند چکّر لگا کر کہا کہ مجھے یہاں خالق کائنات کے وجود کا کہیں نشان نہیں ملا۔ اُس عقل کے اندھے نے یہ سمجھا ہے کہ زمین سے چند ہزار میل کی بلندی پر جانے سے ساری کائنات اُس کی زد میں آگئی ہے اور اب اس کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہا جو اُس کے ادراک سے ماورا ہو۔ اُس کا مشاہدہ ہر لحاظ سے ہمہ گیر ہے اور اُس کی نظر ہر موجود چیز کو دیکھنے کی پوری طرح قدرت رکھتی ہے۔

لیکن یہ سراسر زعم باطل ہے یہ ضروری نہیں کہ جو چیز موجود ہے وہ لازمی طور پر ہمارے مشاہدہ کی گرفت میں بھی ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اُس کے متعلق ہمارے حواس نے جو فیصلہ بھی صادر کیا ہے وہ بھی سو فی صد حق و انصاف پر مبنی ہو۔

چلیئے بالفرض ہم ایک لمحہ کے لیے یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ انسان کے حواس قابلِ اعتماد ہیں، اور ان کے ذریعے انسان جو نتائج حاصل کرتا ہے اُس میں کسی حد تک وثوق پایا جاتا ہے لیکن یہاں آکر پھر ایک سوال انسان کے ذہن میں اُبھرتا ہے کہ کیا انسان کی ان قوتوں میں اتنی استعداد

موجود ہے کہ وہ کائنات کا پوری طرح احاطہ کر سکیں۔

مجرد مشاہدہ اور مطالعہ تو کائنات کے کسی ایک گوشے کو بھی اپنی گرفت میں لینے سے قاصر ہے۔ البتہ اُس نے اپنے دائرہ کو قانون یکسانیت کے ذریعے کافی حد تک پھیلا دیا ہے۔ انسان کے حواس جب فطرت کے عمل کو بار بار دیکھتے ہیں تو پھر دوسرے بہت سے عوامل کو اس ایک عمل پر قیاس کرتے ہوئے پہلے عمل کے مطابق اُن سے نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ اس فکری زقند نے سائنس دانوں کے کام کو بہت مختصر اور آسان بنا دیا ہے۔ لیکن اس میں بھی بہت سے ایسے پہلو ہیں جن پر دل مطمئن نہیں ہوتا۔

اس طرز استدلال کی رُو سے مشاہدہ بذاتِ خود ایک ایسا عمل قرار پاتا ہے جس میں حواس سے کہیں زیادہ انسان کی قوتِ فکر کام دیتی ہے۔ کسی ایک چیز کو دیکھ لینے سے ہم اُس کی حقیقت نہیں جان سکتے۔ جب ہم کسی چیز پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اُس کے مدہم اور غیر مربوط نقوش ہمارے دماغ کی لوح پر اُبھرتے ہیں۔ پھر ہمارا ذہن ان نقوش کو اپنی استعداد اور ضرورت کے مطابق نکھارتا ہے اور اس کے بعد وہ ان کے اندر ترتیب پیدا کر کے اُس کی صورت گری کرتا ہے۔ لیکن ان دونوں مراحل کے طے کرنے کے بعد بھی ذہن کا کام ختم نہیں ہوتا۔ وہ پھر اس چیز کو دوسری دیکھی اور ان دیکھی اشیاء کے ساتھ احساس کے ایک غیر مرئی رشتے میں منسلک کرتا ہے اور اس طرح اُس کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔

آپ خود ان سارے مراحل پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مجرد قوت باصرہ بالکل بیکار ہے۔ اس کی افادیت کے لیے ضروری ہے کہ اس کی پشت پر ذہنی قوت موجود ہو، جو مشاہدہ کے تاثرات میں نظم و ربط پیدا کر کے انہیں مفید اور کار آمد بنائے۔ انسانی ذہن آئینہ کی طرح نہیں ہوتا، جس میں فطرت اپنا عکس جوں کا توں ڈالتی ہے۔ وہ انفعالی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ شعوری طور پر مختلف عناصر و اجزا کے امتزاج سے فطرت کا تصوّر قائم کرتا ہے اور مقاصد کے تحت معروضی حقائق میں تصرف چاہتا ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا کہ انسان کا مشاہدہ بالکل بے لوث ہے صحیح نہیں۔ انسان

جب بھی مشاہدہ کرتا ہے تو اُس میں صرف اُس کی قوتِ باصرہ ہی کام نہیں کرتی بلکہ دل و دماغ کی بہت سی قوتیں شامل ہوتی ہیں اور ناظر کے اپنے احساسات و افکار کا پس منظر اُس کے مشاہدہ کو نہ صرف ایک خاص ترتیب دیتا ہے بلکہ اُسے ایک خاص رنگ میں بھی رنگ دیتا ہے۔ اسی حقیقت کو آپ ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجئے:

ایک انسان جو ایک بلند و بالا ذات پر ایمان رکھتا ہے اور دل و جان سے یہ مانتا ہے کہ یہ کارخانۂ قُدرت یونہی بغیر کسی مقصد کے معرض وجود میں نہیں آگیا بلکہ ایک قادرِ مطلق ذات نے پورے تدبّر کے ساتھ ایک خاص مقصد کے تحت اسے تخلیق کیا ہے۔ وہ جب فطرت کا مشاہدہ کرے گا تو اُس کے ذہن میں اس مشاہدہ کے تاثرات اُس شخص کے تاثرات سے یکسر مختلف ہونگے جو اس کائنات کو کسی مدبّر کی تدبیر کا نتیجہ سمجھنے کی بجائے اسے بخت و اتفاق کی کرشمہ سازی سمجھتا ہے۔ ایک دہریہ جب فضا میں پرواز کرتا ہوا اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات پر نگاہ ڈالتا ہے تو اسے یوں نظر آتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق اور مالک نہیں۔ لیکن اُس کے برعکس جب ایک خدا پرست اس طرح کا مشاہدہ کرتا ہے تو اسے قدم قدم پر اللہ کے وجود کے نشانات ملتے ہیں اُس کی نگاہ میں جوں جوں وسعت پیدا ہوتی ہے اتنا ہی خالقِ کائنات پر اُس کا اعتقاد و ایمان مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔ کائنات ایک ہے لیکن اس کے مشاہدے سے دو الگ الگ طرز پر سوچنے والے انسان ایک دوسرے سے مختلف نتائج کیوں اخذ کرتے ہیں؟ وجہ صاف ظاہر ہے کہ مختلف انسانوں کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز ایک دوسرے سے جداگانہ ہوتا ہے اور وہ اپنی ذہنی ساخت کے مطابق اپنے اس مشاہدہ کو ترتیب دیتے ہیں اور اپنے رجحان کے مطابق اس میں رنگ بھرتے ہیں۔

ہماری ان گذارشات سے یہ حقیقت منکشف ہوگئی ہوگی کہ وہ چیز جسے ہم مطالعہ و مشاھدہ کہتے ہیں اُس میں قوتِ باصرہ سے کہیں زیادہ انسان کے افکار و تصوّرات کارفرما ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ ہم محض حواس پر اعتماد کر کے حقیقت کا ادراک کر سکتے ہیں ایک

وہم ہے۔

علامہ ابنِ خلدون نے اپنی مشہور کتاب "مقدمہ" میں "علم الکلام" کے تحت اس موضوع پر جو بحث کی ہے وہ بڑی فکر انگیز ہے اور اس معاملہ کے بہت سے پہلوؤں کو واضح کرتی ہے ہم یہاں اُس کا ایک حصّہ نقل کرتے ہیں:

"بعض انسان اس زعم میں مبتلا ہیں کہ موجوداتِ عالم اُن کے قوائے مدرکہ سے باہر نہیں ہو سکتے۔ یہ ایک ایسا دعوٰے ہے جس کی عقل اور مشاہدہ دونوں تائید نہیں کرتے۔ آپ کسی بہرے کو دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اُس کے علم کے ماخذ صرف چار حواس ہی ہیں۔ وہ انہیں میں عالمِ وجود کو محدود و محصور پاتا ہے۔ مسموعات اس غریب کے شمار سے نکل جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک اندھا اُس چیز کا انکار کرتا ہے جو صرف قوتِ باصرہ کی زد میں آنے والی ہو۔ اس قسم کے اندھے اور بہرے محض اپنے آباؤ اجداد کی باتوں پر اعتماد اور یقین کرکے اُن چیزوں کے وجود کا اقرار کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، جن میں اُن کے حواس اُن کی اعانت اور دستگیری نہیں کرتے ..... یہ عین ممکن ہے کہ اس کائنات میں ایسے مدرکات موجود ہوں جو ہمارے علم و ادراک سے باہر ہوں .... اور حقیقت تو یہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ ہی ان کا پوری طرح احاطہ کر سکتی ہے۔ اگر کسی وقت آپ یہ دیکھیں کہ آپ کا ادراک اپنے فطری حدود سے تجاوز کر رہا ہے تو آپ فوراً محتاط ہو جائیں اور سمجھ لیجئے کہ یہ کسی فریب میں مبتلا ہو رہا ہے اُس وقت آپ کی عافیت کی ایک ہی صورت ہے کہ آپ شارع علیہ السلام کے بتائے ہوئے عقیدہ اور عمل کو مضبوطی کے ساتھ تھام لیں کیونکہ شارع علیہ السلام آپ سے زیادہ آپ کے خیر خواہ ہیں اور آپ سے کہیں زیادہ آپ کی بھلائی کے طالب ہیں۔ ان کی ذات کو وہ ادراک نصیب ہے جس کی آپ کے ادراک و عقل کو ہوا تک بھی نہیں لگی۔" (صفحہ ۴۵۹-۴۶۰)

یہ تو ہے مشاہدہ کا صرف ایک پہلو۔ اس کا دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ مشاہدہ اپنے عمل کے لئے صرف ذہن انسانی کا محتاج نہیں بلکہ اپنے دائرہ کار کو وسیع کر کے اُس سے نتائج اخذ کرنے کے لیے وہ ہر قدم پر قانون یکسانیت کے تعاون کی ضرورت محسوس کرتا ہے اگر مشاہدہ اس قانون سے اپنا رشتہ منقطع کر دے تو سائنس کے سارے اکتشافات باطل قرار پائیں۔

سائنس کا قانون یکسانیت پر انحصار کوئی ایسا طرز عمل نہیں جس کی عقل تائید نہ کرتی ہو۔ انسان کی فکری اور علمی صلاحیتیں بڑی محدود ہیں اور اُن کے اندر یہ حوصلہ نہیں کہ وہ کائنات کے ہر جزو کو صحیح طریق سے ادراک کر سکیں۔ اس بناء پر وہ بیچارے مجبور ہیں کہ ایک محدود تجربہ کے تحت اُنھوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ اسے وسیع کائنات پر پھیلا کر نتائج کا استنباط کریں۔

انسان کا ذہن ایک ثانیہ کے لیے بھی خلا میں نہیں رہ سکتا۔ وہ کائنات کے بارے میں ایک مجموعی تاثر قائم کرنے کا ہر وقت طالب ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بڑی سرعت کے ساتھ اپنے روزمرّہ کے مشاہدات اور تجربات سے جو فی الواقع حقیقت کا بالکل مبہم سا احساس پیدا کرتے ہیں، پوری کائنات کے بارے میں ایک مجموعی تاثر قبول کرتا ہے اور پھر اسی کی روشنی میں باقی جزئیات کا مطالعہ کرتا ہے۔

انسان کے مشاہدے اور قانون یکسانیت میں ایک نہایت قریبی تعلق موجود ہے۔ وہ کسی شے کا جس انداز سے مطالعہ کریگا اُسی انداز کے مطابق پوری کائنات کا احاطہ کرنے کے لیے وہ قانون یکسانیت کو ترتیب دیگا۔ یہ ضروری نہیں کہ فطرت کے رنگا رنگ مظاہر میں ایک شخص کو جس نوعیّت کی یکجہتی نظر آتی ہے دوسرے کو بھی لازمی طور پر اُسی طرح کی یکجہتی محسوس ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ سائنس دان اس بات کے دعویدار ہیں کہ قانون یکسانیت کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر رکھی گئی ہے اس لئے یہ قانون حتمی اور قطعی ہے لیکن اس معاملے میں بھی سائنس دانوں نے اُسی طرح کی ٹھوکر کھائی ہے جس طرح مشاہدہ کے بارہ میں کھائی تھی۔ قانون یکسانیت کا تعلق بھی مشاہدہ سے زیادہ انسان کے ذہن سے ہے۔ مشاہدہ صرف انسان کے دماغی کارخانہ کو خام مال مہیّا کرتا ہے۔

جہاں اس کے مختلف اجزائے درمیان یکسانیت پیدا کرکے انہیں علّت و معلول کی کڑیوں میں جوڑ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ قانون اپنے وجود کے لیے مشاہدہ سے زیادہ ذھنی قوت کا دست نگر ہے۔ ایک مشہور مفکّر نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

> فطرت کے یہ قوانین جن کا ہم ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں ان کی ترتیب و تدوین میں ہمارے حواس اور ذھنی قوتیں دونوں شریک ہوتی ہیں اور دونوں مل کر ہمارے قلب و دماغ پر ایک تاثر قائم کرتی ہیں ...... ان کی صحت کا انحصار اُس مشین پہ ہے جو مشاہدہ کے دوران کے اندر ایک فکری ربط پیدا کرتی ہے۔[1]

پھر یہ فکری ربط بھی محض مشاہدہ کی قوت اور ذھنی صلاحیت سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس کے پیدا کرنے میں سب سے بڑا دخل اُس مجموعی تاثر کا ہوتا ہے جو انسان اس کائنات کے بارے میں قائم کرتا ہے۔ انسان کا مشاہدہ اور تجربہ چونکہ محدود ہے اور انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ کائنات کے ایک جزو کا مطالعہ کرکے اُس کے متعلق تاثر قائم کرے۔ اس لیے وہ غیر شعوری طور پر بہت سی ایسی باتوں پر ایمان لے آتا ہے جو اُسے بظاہر مادی دکھائی دیتی ہے لیکن درحقیقت وہ مادہ سے ماوراء ہوتی ہیں لیکن اُن میں کسی حد تک یہ صلاحیت ضرور پائی جاتی ہے کہ وہ انسان کے بنیادی احساسات و تاثرات کی صورت گری کر سکیں۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے اس بات پر مجبور ہے کہ وہ مادی دنیا کے طلسم ہوشربا میں گرفتار رہ کر اُن روحانی قوتوں سے لذّت آشنا ہو جو نہ صرف اُسے اس کائنات کے بارے میں ایک مجموعی تاثر قائم کرنے میں مدد دیتی ہیں بلکہ اُسے یقین کی لازوال دولت سے بھی مالا مال کرتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جن چیزوں کو ایک خدا پرست روحانی کہتا ہے وہ ایک مادہ پرست کے نزدیک بھی روحانی ہی ہوں۔ لفظ "روحانی" میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ انسان کا قلب و دماغ کائنات کا مشاہدہ

Lecomte du Nouy: Human Destiny p 22.

ومطالعہ کرنے کے ساتھ اُس حقیقت کبریٰ کا ادراک کرنے کے لیے بھی بے تاب ہوتا ہے جس سے تعلق قائم کیئے بغیر وہ مادی دنیا کی بھول بھلیوں سے نکل کر کائنات کے بارے میں ایک روحانی تاثر قائم نہیں کر سکتا۔ یہ روحانی تاثر ہی اصل میں اُس کے فکر و احساس کا منبع و ماخذ ہے۔ فلسفۂ مذہب کے مصنّف جان کیرڈ نے اس موضوع پر نہایت فکر انگیز بحث کی ہے جسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

"مادہ پرست یوں تو اس بات کا دعویدار ہے کہ اُس کا تعلق صرف مادہ، تجربہ اور مشاھدہ سے ہے، لیکن وہ اپنے ان تجربات اور مشاھدات میں ایسی اصطلاحیں استعمال کرتا ہے مثلاً قوّت، قانون، جن کا تعلق مادی اشیاء سے کہیں زیادہ روحانی چیزوں سے ہے۔ وہ زبان سے ہر اُس چیز کی نفی کرتا ہے جو محسوسات سے ماورا ہو لیکن وہ عملی زندگی میں مافوق الطبعی چیزوں پر اعتماد کیئے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا۔ وہ اپنی تحقیق میں برابر وحدت، کثرت، یکسانیت، علّت و معلول اور اسی قسم کے بہت سے دوسرے تصوّرات سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور انہیں بسا اوقات بغیر کسی نظم کے استعمال بھی کرتا ہے۔ یہ سب تصوّرات اپنی نوعیّت کے اعتبار سے مافوق الطبعی ہیں۔ اس لیے ایک مادہ پرست لاشعوری طور پر روحانیت کا علمبردار ہوتا ہے۔"

انسانی فطرت کا دوسرا بنیادی سوال یہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق اور خود انسان کی تخلیق کا کیا مقصد ہے۔ کیا یہ سارا کارخانۂ قدرت محض کھیل تماشہ کی حیثیت رکھتا ہے جو مادہ کی اندھی بہری قوّتوں کے ذریعہ بالکل بخت و اتفاق سے معرضِ وجود میں آگیا ہے یا اس کی تخلیق کے پیچھے ایک مقصد کار فرما ہے۔ یہ سوال پہلے سوال سے بھی زیادہ اہمیّت رکھتا ہے۔ اسی سوال کے صحیح جواب پر انسانی عزّ و شرف، انسانی آزادی، انسانی اخلاق اور احساس جوابدھی کا دارومدار ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ سوال انسان کے لیے جتنا اہم اور ضروری ہے اتنی ہی سائنس اس کے جواب دینے میں ناکام ہوئی ہے۔ سائنس دان بالکل کھُل کر اس کا

اعتراف کرتے ہیں کہ سائنس کا کام عالمِ طبعی کے مختلف گوشوں کی صرف نقاب کشائی ہے۔ یہ کائنات کس مقصد کی تکمیل کے لیے معرضِ وجود میں آئی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا سائنس کے پاس قطعاً کوئی جواب نہیں اور نہ وہ اس کا جواب دینے کی کچھ استعداد رکھتی ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے سائنس دانوں نے اس حقیقت کو کھلے الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔ پروفیسر وائٹ ہیڈ اپنی ایک فاضلانہ تصنیف میں صاف طور پر لکھتا ہے:

"سائنس جس کا سارا انحصار اور دار و مدار صرف حواس پر ہے اور جو مشاہدہ کے ایک ذریعہ کے علاوہ اور کسی ذریعہ کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتی، اگر یہ دعوےٰ کرے کہ وہ تنہا زندگی کے سارے مسائل کو حل کر سکتی ہے، تو اس کا یہ دعوےٰ بالکل لغو اور بیکار ہے۔ سائنس اس کائنات میں افراد کے لئے مسرت و شادمانی کا کوئی سامان مہیا نہیں کر سکتی، وہ اس کائنات کی تخلیق کے اندر کسی مقصد کی نشان دہی کرنے سے بھی قاصر ہے۔ اُس کا تعلق تو محض اُن اصولوں سے ہے جن کے تحت اس کارخانہ قدرت میں فطرت اپنے عمل کو دُھراتی ہے"[1]

اب اگر یہ مان لیا جائے کہ اس کائنات کی تخلیق کے پیچھے نہ تو کوئی مقصد کام کر رہا ہے اور نہ ارادہ کار فرما ہے تو پھر یہ سارا نظام مادہ کے ہاتھ میں صرف ایک کھلونا بن کر رہ جاتا ہے جس سے مادہ جس طرح چاہیے کھیلتا رہے۔ کائنات کی جو کچھ قدر و قیمت ہے۔ وہ مقصد کے تحت ہی ہے۔ اگر مقصد آنکھوں سے اوجھل ہو جائے تو پھر اس کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔

اس مقام پر وہی اُلجھن پیش آتی ہے جو ہمیں پہلے سوال میں پیش آئی تھی یعنی ہماری فطرت سب سے پہلے اس چیز کا مطالبہ کرتی ہے کہ ہم اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کے بارے میں جس سے ہمیں ہر وقت سابقہ درپیش ہے ایک اساسی نقطۂ نظر قائم کریں۔ کیونکہ یہ نقطۂ نظر قائم کئے بغیر

---

[1] An Introduction to the Philosophy of Religion

ہم کائنات کیساتھ کوئی جذباتی اور شعوری تعلق قایم نہیں کرسکتے ہیں ہمیں اس کائنات میں ایک غیر متعلق تماشائی کی حیثیت سے نہیں اُتارا گیا۔ ہمارا اس سے ایک نہایت ہی گہرا رابطہ ہے۔ اس کے مناظر، اس کی قوتیں اور اس کی وسعتیں ہر لمحہ ہم پر اثر انداز ہوتی ہیں اور دوسری طرف ہم بھی انہیں ہر لمحہ متاثر کرتے رہتے ہیں۔

اگر انسان کائنات میں پیدا ہوکر اُس سے بالکل بے تعلق رہ سکتا تو پھر مقصد کے تعین کی زیادہ ضرورت پیش نہ آتی لیکن جب انسان اور کائنات کے درمیان ایک نہایت ہی گہرا رابطہ موجود ہے۔ بلکہ انسان کائنات کا ایک نہایت ہی اہم جزو ہے۔ تو ان حالات میں انسان تخلیق کائنات کے مقصد سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔ وہ اس کے ساتھ شعوری تعلق پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ طے کریگا کہ اس کائنات کو اور انسان کو آخر کس مقصد کی تکمیل کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ کیونکہ مقصد کا تعین کر لینے کے بعد ہی کائنات اور انسان کے باہمی تعلق کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

اگر یہ کائنات مادہ کے اندھے بہرے لزوم کا ایک تماشہ ہے تو پھر فکری دلیل حیران ہے کہ ایک بے منصوبہ اور بے مقصد عمل سے نظم و ربط کیسے ظاہر ہو گئے۔ وحدت کثرت میں کس طرح جلوہ گر ہوئی۔ بے ترتیب، منتشر اور غیر مربوط مظاہر کائنات نے آخر یہ کیونکر گوارا کیا کہ وہ اپنی آزادی بلکہ آوارگی کو ترک کر کے قانون یکسانیت کی غلامی اختیار کر لیں۔

قدرت کے یہ سارے کرشمے زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں انہیں بغیر کسی منصوبہ اور مقصد کے تخلیق نہیں کیا گیا بلکہ وہ قدرت کے ایک عظیم منشا کو پورا کرنے کے لیے معرضِ وجود میں لائے گئے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اُن کے اندر اس حیرت انگیز نظم و ربط کی بجائے زبردست انتشار اور اختلال ہوتا۔ سائنس دانوں نے جو قدرت کے ان کرشموں کے درمیان علّت و معلول کے رشتے تلاش کیئے ہیں وہ خود اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ انہیں ایک خاص مقصد کے تحت ایک دوسرے سے منسلک کیا گیا ہے۔ علّت و معلول کا رشتہ بذاتِ خود مقصد

اور منصوبہ بندی کی غمازی کرتا ہے۔

یہ ہے وہ فکری انتشار جو تخلیق کائنات کے بے مقصد ہونے کے بارے میں مادہ پرستوں کے اندر پایا جاتا ہے۔

پھر تخلیقِ انسان کو بے مقصد قرار دے کر سائنس دانوں نے اور بھی زبردست ٹھوکر کھائی ہے۔ اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ انسان بھی کائنات کے دوسرے مظاہر کی طرح ایک ایسی بے مقصد مخلوق ہے جو بے شعور مادہ کے ہاتھ میں ہر آن ایک کھلونے کی طرح کھیلنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے تو پھر انسان کے کسی فعل پر نیک و بد، محمود و مذموم کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ کیونکہ جو عمل بالکل میکانکی طور پر اندھے بہرے لزوم کی کارفرمائی سے واقع ہو اُسے کبھی اچھا اور بُرا نہیں کہا جا سکتا۔ اس استدلال کی بنا پر ہر قسم کے معاشرتی مظالم، سیاسی جبر اور معاشی استحصال کو جائز ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ سب کچھ انسان بے بسی کے عالم میں کرتا ہے۔

انسانی اعمال میں خیر و شر کی تمیز صرف مقصد ہی سے پیدا ہوتی ہے اگر تخلیق کا کوئی مقصد نہ ہو تو نیکی کو بدی سے، شرافت کو رذالت سے ممیّز اور ممتاز نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرے انسان اپنے اعمال کا صرف اُسی صورت میں ذمہ دار ہو سکتا ہے جب ہم یہ تسلیم کریں کہ وہ مادہ کے ہاتھ میں مجبورِ محض نہیں بلکہ اپنا ارادہ اور اختیار رکھتا ہے۔ اُس کے اندر اخذ و ترک کی قوّت اور صلاحیت موجود ہے۔ وہ اپنی مرضی سے ایک طرزِ عمل کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

مقصد اور اختیار ہی دو ایسی بنیادیں ہیں جن پر انسان کا سارا اخلاقی، معاشرتی اور روحانی نظام قائم ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ حیاتِ انسانی کے لئے یہ دو بنیادیں جتنی اہم ہیں اتنا ہی سائنس ان سے بے تعلق ہے۔ صحیح بات ہے کہ سائنس اپنے مزاج کے اعتبار سے اس بات پر مجبور ہے کہ وہ ان کے متعلق کسی قسم کی لب کشائی کی جسارت نہ کرے۔ بہت سے ایسے سائنس دان جو علوم طبعی کے فطری حدود سے واقف ہیں اُنھوں نے ہمیشہ ان حدود کا احترام کیا ہے اور جب بھی سائنس نے کسی زعم

باطل میں گرفتار ہو کر ان فطری حد بندیوں سے نکلنے کی کوشش کی تو وہ اس کے راستے میں مزاحم ہوئے۔ لیکن سائنس پر ایمان رکھنے والوں میں ایسے نادان پرستاروں کی کمی نہیں جنہوں نے پندار اور ضد میں آ کر اس بیچاری کو ایسے کوچوں میں گھسیٹنا شروع کیا جہاں اس کا گذر بالکل ناممکن ہے اور اس طرح اسے ذلیل اور رسوا کیا۔ اس کا گلا گھونٹ کر اس سے اُن سوالات کے جوابات اُگلوانے کی کوشش کی جو کبھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتے تھے۔ پروفیسر اڈنگٹن نے کس قدر صحیح کہا ہے:

"ہمیں اس امر کا اعتراف ہے کہ علوم طبعی نے جس چیز کی تلاش و جستجو کی ہے وہ حقیقت کا محض ایک پہلو ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ دوسرے پہلوؤں کا کس طرح ادراک کیا جائے۔ حقیقت کے دوسرے گوشوں کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کا حیات انسانی سے موجودات طبعی کی بہ نسبت کم تعلق ہے۔ ہمارے احساسات، ہمارے مقاصد اور ہماری قدریں ہمارے شعور کا ویسا ہی جزو لاینفک ہیں جیسے حسی تاثرات جن کی رہنمائی میں ہم نے عالم محسوسات کی بادیہ پیمائی کی۔ لیکن جب ہم اپنی شخصیت کے محرکات کے تحت قدم بڑھاتے ہیں تو ہمیں اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے قدم ہمیں زمان و مکان کی محدود دنیا کی بجائے کسی دوسرے عالم کی طرف لئے جا رہے ہیں۔